ریفرنڈم کے بعد

اصلاحات کا تسلسل یا اصلاحِ احوال

پروفیسر خورشید احمد

منشورات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان اپنے منصوبے بناتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو اصل حاکم اور کارفرما ہے اپنی تدبیر کرتا ہے اور بالآخر ہوتا وہی ہے جو مشیت الٰہی کا تقاضا اور رضائے الٰہی کا مطلوب ہوتا ہے (وَمَکَرُوا وَمَکَرَ اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ خَیۡرُ الۡمٰکِرِیۡنَ، وہ اپنی تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے اپنی تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ آل عمرٰن ۳:۵۴)۔ یہی وجہ ہے کہ بارہا انسان کو ایک چیز بری لگتی ہے لیکن بالآخر اس کے نتائج اور ثمرات کچھ دوسرے ہی نکلتے ہیں اور ایک چیز کو وہ بہت شوق اور اہتمام سے کرتا ہے مگر اس کے ساتھ نقصان اور ہزیمت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (وَعَسٰۤی اَنۡ تَکۡرَهُوۡا شَیۡئًا وَّهُوَ خَیۡرٌ لَّکُمۡ ۚ وَعَسٰۤی اَنۡ تُحِبُّوۡا شَیۡئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ، ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بری ہو--- اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے۔ البقرہ ۲:۲۱۶)

بصیرت کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالیہ ریفرنڈم میں بھی قضا و قدر کے ایک ایسے ہی قاعدے کی کارفرمائی تھی۔ جنرل پرویز مشرف جن کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تقریباً پوری قوم کی تائید حاصل تھی اور ایک ناگوار عمل (فوجی مداخلت) کو اصلاح احوال

کی ایک اُمید کی بنیاد پر تمام دینی اور سیاسی قوتوں نے، باستثنائے چند، اس لیے قبول کیا تھا کہ غیر جانب دار احتساب کے ذریعے ملک کو لوٹنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جا سکے گا اور جلد از جلد ملک میں آزاد انتخابات کے ذریعے ایک نئی اور امانت دار قیادت اُبھر سکے گی، لیکن اس قومی ایجنڈے پر عمل کرنے کے بجائے انھوں نے اپنا ہی ایک ایجنڈا تصنیف فرما ڈالا۔ احتساب کو ایک مذاق اور التفات و انتقام کا آلہ بنا ڈالا۔ ملک کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور اور مجروح کرنے والی سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ فوج میں اکھاڑ پچھاڑ اور سیاست میں ”ہم خیالوں اور ”شاہ پرستوں“ کا کھیل شروع کر دیا۔ بھارت سے پینگیں بڑھانے اور امریکہ کے عالمی کھیل میں ایک بے جان مہرہ بن جانے تک پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر امریکہ کو کندھا دے کر افغانستان کے معصوم انسانوں کے خونِ ناحق کی ذمہ داری بھی اپنے شانوں پر لے لی، اور امریکہ کی دوستی کے زعم میں پھولے نہ سماتے ہوئے ایک قسم کی کامرانی اور فیروز مندی (triumphalism) کے طلسم کا شکار ہو کر بش کی طرح غرور و تکبر کا مظاہرہ کرنے لگے۔ اے آر وائی ٹیلی وژن کو انٹرویو دیتے ہوئے یہاں تک فرما دیا:

People tell me I am popular, I thought I am

really popular,
I must go to the people.

لوگ مجھے بتاتے ہیں کہ میں مقبول ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں واقعی مقبول
ہوں، مجھے عوام کے پاس جانا چاہیے۔

ریفرنڈم کے اعلان والی ۱۰۰ منٹ کی تقریر میں ۱۱۷ بار ”میں“ کا استعمال واحد متکلم کے صیغہ میں فرمایا۔ ۳۱ مارچ ۲۰۰۲ء کے اخبارات میں ان کا یہ ارشاد بھی شائع ہوا کہ

I will not follow Ayub or his models.

میں ایوب یا اس کے جیسوں کی طرح نہیں۔

اور یہ کہ ریفرنڈم ان کے لیے ایک ایسا مینڈیٹ ہوگا جس کے نتیجے میں اکتوبر کے انتخابات کے بعد پارلیمنٹ پر بھی ان کی بالادستی قائم رہے گی اور بقول ان کے:

> وہ مجھے اس طرح سے بلیک میل نہیں کرسکیں گے جس طرح انھوں نے جنرل ضیا کو کیا۔

نئے وزیراعظم کے بارے میں بھی ان کا ارشاد تھا کہ ”اسے کوئی غلط قدم نہیں اٹھانے دیا جائے گا، وہ صدر اور چیف آف اسٹاف بھی رہیں گے اور پارلیمنٹ اور فوج سب ان کے حکم کے تابع ہوگی“۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں ریفرنڈم کا ڈراما رچایا گیا۔ یہ صرف جیتنے کے لیے تھا۔ اس کے دو مقاصد تھے، ایک وہ سند جواز (legitimacy) حاصل کرنا جو اقتدار پر قابض ہونے کے باوجود ان کو حاصل نہیں، اور دوسرے اپنے اقتدار کی مدت کو طول دینا کہ سپریم کورٹ کی عطا کردہ تین سال کی مہلت اب ختم ہو رہی ہے اور ان کو ملک کے نظام کی تشکیل نو اور اپنی ”اصلاحات“ کے تسلسل اور تکمیل کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ ملک اور فوج کے ہر بہی خواہ کے مشورے کے باوجود کہ وہ یہ حرکت نہ کریں، اپنی کامرانی اور امریکہ کی پشت پناہی کے نشے میں وہ باوردی اور بلاوردی ریفرنڈم میں کود گئے اور فوج، انتظامیہ، بلدیاتی اور سیاسی ہم خیالوں کو بھی اس جنگ میں جھونک دیا اور بالآخر الیکشن کمیشن کے سربراہ سے، جو خیر سے سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ چیف جسٹس بھی ہیں، یہ اعلان کروا لیا گیا کہ ۷۰ فی صد ووٹروں نے ریفرنڈم میں شرکت کی اور ان کے ۹۸ فی صد نے پرویز مشرف صاحب کے حق میں ووٹ دے کر ان کو بے مثال مینڈیٹ سے سرفراز کر دیا ہے۔ اعلان تو ہو گیا مگر اس کے ساتھ ہی ساری دنیا میں ایک شور اُٹھ گیا اور خود سرکاری حلقوں میں ”پریشانی“ اور کھلبلی مچ گئی۔ جس طرح جناب ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں کامیابی کے حصول کی سعی میں ناکامی و نامرادی کا راستہ ہموار کیا بالکل اسی طرح جنرل پرویز مشرف نے بھی اس ریفرنڈم کے ذریعے اپنی پاک دامنی، حقیقت پسندی، صاف گوئی اور بے نفسی کا بھانڈا پھوڑ دیا اور ملک اور ملک سے

باہر ہر طرف سے یہ آواز آنے لگی کہ "بادشاہ بے لباس ہے، بادشاہ بے لباس ہے"۔ شیکسپیئر نے انسان کے کردار کا بڑا عبرت ناک نقشہ کھینچا ہے جس کی نظیر زمان و مکان کے فرق سے ہر دور میں دیکھی جاسکتی ہے۔

Man, proud man,
Dressed in little brief authority
Plays such fantastic tricks before high heavens
A made the Angels weep!

انسان خود پسند اور متکبر
قوت کی ذرا سی کرتی میں ملبوس!
قادر مطلق کے سامنے ایسے ایسے کرتب دکھاتا ہے
کہ فرشتے بھی حیران و اشکبار ہو جاتے ہیں۔

لیکن بالآخر نتیجہ وہی ہوتا ہے جو خدا کو مطلوب ہے۔ سچ ہے: Man proposes, God disposes

عدالت عالیہ کا فیصلہ

ریفرنڈم کے اس معرکے میں جنرل پرویز مشرف کو پہلی چوٹ اس وقت لگی جب عدالت عالیہ نے اپنا دامن بچاتے ہوئے ایک ایسا فیصلہ دیا جسے سیاست کی جدید اصطلاح میں Non-decision ہی کہا جاسکتا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ آیا صدر کے انتخاب کے لیے ریفرنڈم کو کوئی دستوری جواز حاصل ہے یا نہیں؟ خود جنرل صاحب نے ۵ اپریل ۲۰۰۲ء کو ایک پریس کانفرنس میں اس ریفرنڈم کے جواز میں ۱۹۷۳ء کے دستور کی دفعہ (۶) ۴۸ کو پڑھ کر سنایا تھا اور بڑے فخر سے اسے اپنی تائید میں پیش کیا تھا، مگر سپریم کورٹ میں امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد صاحب کی پٹیشن پر بحث کے پانچویں دن سرکاری وکیل نے یہ موقف اختیار کیا کہ ریفرنڈم دستور کے تحت نہیں

بلکہ پی سی او کے تحت ہونا ہے۔ عدالت نے اس نکتے کو پکڑ لیا اور یہ موقف اختیار کرلیا کہ ریفرنڈم ایک ماورائے دستور اقدام ہے جس کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ انتخابات کے بعد پارلیمنٹ کرے گی۔ دوسرے الفاظ میں ریفرنڈم کے ذریعے اگر کوئی ''حق'' جنرل صاحب کو حاصل ہو بھی رہا ہے تو وہ اکتوبر ۲۰۰۲ء تک ہے۔ دستور کی بحالی کے بعد فیصلہ دستور کے تحت نئی پارلیمنٹ کرے گی۔ اس نے ریفرنڈم کے ذریعے سند جواز حاصل کرنے کی کوشش کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔

ریفرنڈم کی دستوری اور قانونی بنیاد کے ختم ہوجانے کے بعد صرف اس کی سیاسی اور اخلاقی بنیاد رہ جاتی ہے جس کے بارے میں مرکزی وزیر قانون کا ۱۵ اپریل ۲۰۰۲ء کا وہ انٹرویو اہم ہے جو بی بی سی کے سیربین پروگرام میں انھوں نے دیا اور اس میں یہ کسوٹی پوری دنیا کے سامنے رکھی کہ

> اگر یہ ریفرنڈم شفاف اور سرکاری مداخلتوں سے پاک نہ ہو تو پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

جو کچھ ۳۰ اپریل کو ہوا وہ ایک ایسی داستان ہے جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ''سنتا جا، شرماتا جا''۔ جس پیمانے پر، جس دھڑلے اور بے باکی سے، جس بے شرمی اور ڈھٹائی سے، اور جس جس انداز میں بدعنوانیوں کا ارتکاب کیا گیا ہے وہ ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ ملک اور ملک سے باہر یہ بات زبان زد خاص و عام ہے۔ خود سرکاری حلقوں میں کھلبلی ہے۔ ووٹر ٹرن آؤٹ کے بارے میں ۷۰ فی صد، پھر ۶۰ فی صد، پھر ۵۶ فی صد اور بالآخر ۵۴ فی صد کی باتیں ہو رہی ہیں۔ وزیر اطلاعات فرما رہے ہیں کہ ۲۵ اور ۳۰ فی صد بھی کافی ہیں۔ سروے کرنے والی کمپنیوں کے سروے لائے جا رہے ہیں مگر وہ بھی کہتے ہیں ۴ کروڑ ۳۰ لاکھ ووٹر کا آنا ناممکن ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی کروڑ کا امکان ہے۔ واقفانِ حال کی زبان میں لائے جانے والے ووٹروں اور نکلنے والے ووٹوں میں ایک اور ۱۰ کی نسبت ہے۔ جنرل صاحب اور ان کی کابینہ بھی مجبور ہوئے ہیں کہ گھنٹوں اپنے اس کارنامے پر سرگرداں ہوں! ملک اور ملک سے باہر شائع

ہونے والے آزاد اور موقر تبصروں اور جائزوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس ریفرنڈم کو کسی درجے میں بھی قابل اعتنا سمجھتا ہو اور جس کا حاصل یہ نہ ہو کہ جنرل صاحب کی اگر کوئی آبرو تھی تو آج وہ پارہ پارہ ہے۔ موصوف کے صاف گو ہونے کی جو ایک شہرت تھی اس کا بھی کوئی شائبہ باقی نہیں رہا ؏

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی!

ملکی جرائد اور مبصرین کی نظر میں

یکم مئی سے ۵ مئی تک شائع ہونے والے دنیا کے کونے کونے کے اخبارات و رسائل ریفرنڈم کے بوگس اور ڈھونگ ہونے پر شاہد ہیں۔ ہماری نگاہ سے تین درجن سے زیادہ موقر جرائد و رسائل کے تبصرے گزرے ہیں اور جنرل صاحب کے بڑے سے بڑے مداح نے بھی بالآخر یہی کہا ہے کہ یہ ریفرنڈم لاحاصل اور بدنامی کا ذریعہ بنا ہے، اور آج تک بیش تر مغربی ممالک نے تہنیت کا رسمی پیغام بھی نہیں دیا بلکہ کامن ویلتھ اور یورپی پارلیمنٹ کے نمایندوں نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے، اور امریکہ نے ‘اندرونی معاملہ’ کہہ کر یہ ضرب بھی لگا دی ہے کہ اکتوبر کے انتخابات کو آزادانہ اور منصفانہ ہونا چاہیے۔ جماعت اسلامی، مسلم لیگ (ن) اور اے آر ڈی نے ریفرنڈم پر اپنے اپنے “وائٹ پیپر” میں وافر معلومات فراہم کی ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی رسائل بدعنوانیوں کی داستانوں سے بھرے پڑے ہیں۔ کچھ صاحب ضمیر افسران نے اپنی شہادت اخبارات میں شائع کرائی ہے کہ کس طرح ان کو دباؤ کا نشانہ بنایا گیا اور خلاف قانون و اخلاق ووٹوں کے ڈبے بھرنے پر مجبور کیا گیا اور ایک دو نہیں، ہزاروں انسانوں کو ان بدعنوانیوں میں ملوث کرنے کے لیے جبر و اقتدار کی قوت کو استعمال کیا گیا۔ اس سلسلے میں کراچی کے ۲۰ ویں گریڈ کے ایک پروفیسر کا خط جو روزنامہ ڈان کی ۱۰ مئی ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے جنرل پرویز مشرف اور ان کی پوری regime کے لیے ایک بڑا جرم (indictment) ہے جس کی گرفت سے وہ نہ دنیا میں بچ سکیں

گے اور نہ آخرت میں۔

میں کراچی کے ایک کالج میں متعین بیسویں گریڈ کا پروفیسر ہوں اور ۳۰ اپریل کے ریفرنڈم میں ایک مقامی پولنگ اسٹیشن پر مجھے پریذائیڈنگ آفیسر مقرر کیا گیا تھا۔ تین بجے کے قریب جین اور رنگین قمیص میں ملبوس ایک ڈی ایس پی میرے پولنگ اسٹیشن پر آیا اور ڈالے جانے والے ووٹوں کے بارے میں دریافت کیا۔ میں نے اس کو بتایا کہ اس وقت تک ۷۰ مرد اور ۱۶ خواتین، یعنی کل ۸۶ افراد نے ووٹ ڈالے ہیں۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں اس تعداد کو بڑھا کر ۸۰۰ کر دوں۔ میں اس کے اس طرز عمل پر ششدر رہ گیا اور کہا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں ۸۰۰ افراد کے نام، شناختی کارڈ نمبر اور ان کے دستخط کہاں سے لاؤں۔ اس کے بعد اس نے مجھے کرسی سے اٹھایا اور اپنے ایک سینئر کے پاس لے گیا جو باہر اپنی ایئر کنڈیشنڈ موبائل میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ایک مسکراہٹ کے ساتھ ان ہی الفاظ کو دہرایا۔ بعد میں یونیفارم میں ملبوس وہ شخص گاڑی سے باہر آیا اور مجھے سنگین نتائج کی دھمکی دے کر واپس چلا گیا۔ ایک شدید حیرت اور استعجاب کی کیفیت میں، میں نے اپنے پولنگ کے عملہ کو ساری بات بتائی جس سے وہ بھی خوف زدہ ہو گئے۔

میں ابھی اس صدمے کی کیفیت سے باہر نہیں آ سکا تھا کہ پانچ بجے کے قریب علاقے کا ایس ایچ او اپنی سرکاری موبائل میں آیا اور مجھے پولنگ اسٹیشن سے باہر بلایا اور ووٹوں کی تعداد (جو اس وقت بڑھ کر ۹۳ ہو گئی تھی) کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد پوچھا کہ مجھے ووٹوں کی کتنی کتابیں فراہم کی گئی تھیں؟ میں نے اسے بتایا کہ ۱۱ کتابیں، یعنی ۱۱۰۰ ووٹ۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ میں ۱۰ کتابوں کے ووٹ ڈلواؤں۔ میرے انکار پر وہ میری بے عزتی کرنے پر اتر آیا جس پر میں نے اسے کہا کہ وہ اپنا رویہ درست رکھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کبھی میرے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے موبائل میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو سادہ کپڑوں میں ملبوس تھے اور کہا کہ ”تم نے ان لوگوں کو ووٹ ڈالنے سے روکا ہے جس کے لیے وہ تمھارے خلاف

ایف آئی آر درج کرانے آئے ہیں‘‘۔ میرے پولنگ اسٹاف نے حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنے کے بعد ان سے تعاون کرنے ہی میں عافیت جانی۔ اس کے بعد میں تمام رات سو نہ سکا اور صرف ایک سوال رہ رہ کر مجھے پریشان کرتا رہا۔ میں ریٹائرمنٹ کے نزدیک ہوں ان حالات میں میرے بچوں کا مستقبل کیا ہے؟ تاہم میرے بیٹوں نے مجھے تسلی دی۔ میرا بڑا بیٹا انجینئر ہے اور چھوٹا ادویات کے شعبے سے متعلق ہے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ اب وہ کسی اور ملک میں جا بسیں گے۔ اسے کیا کہا جائے؟ کیا یہ برین ڈرین ہے یا عزت نفس، ذہنی سکون اور تحفظ کی خاطر ترکِ وطن۔ اس سوال کا جواب کون دے گا!

اس ریفرنڈم نے اگر ایک طرف جنرل پرویز مشرف کی سیاسی اور اخلاقی ساکھ کو خاک میں ملا دیا ہے اور ان کے اس پورے دور کو پاکستان کی تاریخ کا ایک تاریک ترین دور بنا دیا ہے، تو دوسری طرف جس پیمانے پر قوم کے اخلاقی زوال کا اہتمام کیا گیا ہے اور خصوصیت سے فوج، پولیس، سرکاری انتظامیہ اور نومنتخب ناظموں اور کونسلروں (باستثنائے چند) کو بداخلاقی اور بدعنوانی کا آلۂ کار بنا کر جس نظام حکمرانی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اس نے پورے معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا ہے، اور فرائیڈے ٹائمز (۹ مئی ۲۰۰۲ء) جیسے جرائد جو انھیں ترقی پسند، آزاد خیالی اور سیکولرازم کا ہیرو بنا کر پیش کر رہے تھے وہ بھی اس فراڈ پر نوحہ کناں ہیں۔ نجم سیٹھی نے ریفرنڈم کو ’’بے شرمی‘‘ (disgraceful) کا شاہکار قرار دیا:

> برا، بہت برا--- نچلی سطح اور متوسط سطح کے ہزاروں لاکھوں سرکاری ملازمین، مزدوروں، اسکول اساتذہ، چپڑاسیوں، جمعداروں، قیدیوں، فوجیوں، نیم فوجیوں، پولیس ملازمین وغیرہ کو نجی اور سرکاری آجروں کی طرف سے حکم دیا گیا کہ انھیں ملازمت میں رہنا ہے یا نہیں رہنا۔ پاکستان کی خراب انتخابی تاریخ میں بھی اس کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔

اسی طرح جنرل پرویز مشرف کے ایک بڑے حامی، اقلیتوں کے نمائندے اور

سابق ایم این اے، ایم پی بھنڈارا کا تبصرہ بھی حقیقت حال کو سمجھنے میں مددگار ہے:

> ریفرنڈم کے واقعات نے صدر کو مشکوک بنا دیا ہے۔ ریفرنڈم میں اداراتی طور پر دھاندلی کی گئی۔ اخبارات میں جو کہانیاں چھپ رہی ہیں وہ مستند محسوس ہوتی ہیں۔ اس بھونڈے انداز کے واقعے سے پہلے صدر اپنے غیر مشتبہ کردار کے حوالے سے زیادہ بلند تھے۔ کیا سیاست سے اپنے پہلے ٹکراؤ کے بعد مسٹر کلین نے اپنا اعتبار کھو دیا ہے؟ (روزنامہ ڈان، ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء)

یہ تو رہا سیکولر لابی کا فتویٰ۔ رہے وہ افراد جن کو ان کے سیکولرازم سے دل چسپی نہ تھی مگر ملک کے مفاد میں اور ان کے محبِ وطن ہونے کے ناطے ان پر اعتماد کر رہے ہیں، وہ بھی چیخ اٹھے ہیں۔ ہم صرف ایک مثال سابق مرکزی سیکرٹری جناب روئیداد خاں کی پیش کرتے ہیں جن کی آہ و بکا میں ہزاروں نہیں لاکھوں مخلص پاکستانیوں کی آرزوؤں کا خون دیکھا جا سکتا ہے:

> دو سال قبل صدر مشرف کو عام طور پر عوام کا چیمپئن سمجھا جاتا تھا۔ آج وہ آسانی سے فراموش کیے جانے والے حکمرانوں کی طویل قطار میں آخری فرد کی حیثیت سے شمار کیے جانے کے خدشے کا شکار ہیں۔ چرچل کے الفاظ میں اس کی حکومت کے گذشتہ ڈھائی سال ٹڈیاں کھا گئیں۔ پاکستان میں تبدیلی لانے کے ان کے امکانات تیزی سے ختم ہو رہے ہیں اگرچہ وہ اصلاحات کا ڈھنڈورا پیٹنے میں مصروف ہیں۔

کم ہی لوگوں کو ایسے مواقع ملے ہوں گے جیسے جنرل مشرف کے سامنے موجود ہیں۔ یہ بد قسمتی ہے کہ وہ دروازے میں عزم کے ساتھ داخل نہیں ہوئے۔ ۳۰ اپریل کو وہ دروازہ نہایت زور سے ان کے لیے بند کر دیا گیا۔ اس روز انھوں نے جواز کی تلاش میں فیصلہ کن اقدام کیا۔ اسی روز خاموش اکثریت نے بھی ایک پیغام بھیجا جو بہت صاف اور واضح تھا۔ وہ، وہ اعلیٰ اخلاقی تائید کھو چکے ہیں جو انھیں کبھی حاصل تھی۔

ریفرنڈم کے نتائج میں دھاندلی کی اپنی حرکیات (dynamics) ہیں۔ اسے

کنٹرول نہیں کیا جا سکتا اور بعض اوقات طے شدہ نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس نے ریفرنڈم کو بے وقعت کر دیا اور صدر کو اپنی عظیم فتح کے پھل سے محروم کر دیا۔

مجھے ذاتی طور پر جنرل مشرف پر اعتماد تھا جب انھوں نے ۱۲ اکتوبر کو اختیارات پر قبضہ کیا۔ لیکن آخر میں، میں نہایت تشویش سے کہتا ہوں کہ انھوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی جس پر ہم اعتماد کر سکیں، ایسی کوئی بات نہیں کہ جس پر فخر کر سکیں بلکہ بہت سی ایسی باتیں ہیں جس پر ہم توہین محسوس کریں۔ (روزنامہ ڈان، ۱۳ مئی ۲۰۰۲ء)

یہ صرف روئیداد خاں ہی کا قول فیصل نہیں، پوری قوم کے دل کی آواز ہے ؎

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو
برا کہے جسے دنیا اسے برا سمجھو

غیر ملکی مبصرین و جرائد کا تبصرہ

جنرل صاحب کے اس ریفرنڈم نے ملک ہی میں ان کو رسوا نہیں کیا بلکہ پوری دنیا میں ان کی اور پاکستان کی ساکھ اتنی پست اور ہماری تصویر کبھی اتنی پراگندا نہ تھی جتنی آج ہے۔ لندن ٹائمز نے کہا کہ ”ریفرنڈم پیچھے کی طرف ایک قدم ہے“۔ (یکم مئی ۲۰۰۲ء)

لندن کے موقر جریدے فنانشل ٹائمز نے اسے مشرف کے نظام کے غیر قانونی ہونے کا اشتہار قرار دیا ہے:

”مشرف کی حکومت کے عدم جواز کا دنیا کے سامنے اشتہار“

نیویارک ٹائمز (یکم مئی ۲۰۰۲ء) نے ادارتی تبصرے میں لکھا کہ:

جنرل مشرف نے یقیناً پاکستان میں ایک دھاندلی پر مبنی ریفرنڈم جیتا۔

بوسٹن گلوب نے ۲ مئی ۲۰۰۲ء کے شمارے میں اس ریفرنڈم کے بارے میں یہ فتویٰ دیا:

اپنی حکومت پر ریفرنڈم جیسے انتخابی ڈھونگ کو سیاسی منافقت قرار دینا چاہیے، وہ

خراج جو نیکی بدی کو ادا کرتی ہے۔

لاس اینجلز ٹائمز (۳مئی ۲۰۰۲ء) کا تبصرہ بھی قابل ملاحظہ ہے:

> بطور صدر پانچ مزید سال حاصل کرنے کی کوشش میں جنرل مشرف نے اپنے آپ کو گرا لیا۔ جنرل جو آغاز میں صاف بات کرنے والا سپاہی دِکھتا تھا اب ذاتی اقتدار کا حریص، چالاک سیاست دان نظر آتا ہے۔ ہر طرح کے بیانات سے ثابت ہے کہ ٹرن آؤٹ بڑھانے کے لیے اور حمایت کی شرح بڑھانے کے لیے ووٹنگ میں دھاندلی کی گئی۔

دی بالٹی مورسن نے اس اعتراف کے بعد کہ ۱۹۹۹ء میں مشرف کا اچھے لفظوں میں ملک میں استقبال ہوا تھا لیکن اس ریفرنڈم نے سارا بھرم کھول دیا، لکھا:

> ایسا ریفرنڈم کیوں کروایا جائے جس میں اتنی صاف اور کھلی دھاندلی ہو، جیسے اس ہفتے پاکستان میں ہوئی؟ بیلٹ بکس بھر دیے گئے، رجسٹریشن کے قواعد نظرانداز کیے گئے، سرکاری ملازمین کو اکٹھا کر کے ووٹ ڈلوائے گئے۔ یہ فراڈ کی آندھی تھی۔

سارے اخبارات و رسائل اسی دل خراش داستان اور اس منہ کالا کرنے والی کہانی سے بھرے پڑے ہیں۔ اکانومسٹ نے اسے بوگس اور فراڈ کہا ہے اور نیوزویک (۱۳مئی ۲۰۰۲ء) نے ریفرنڈم کے لوحِ مزار پر یہ کتبہ تحریر کیا ہے:

> پاکستان کے فوجی حکمران جنرل پرویز مشرف اپنے اقتدار کے لیے مزید جواز چاہتے ہیں۔ گذشتہ ہفتے انھوں نے زیادہ ہی جان توڑ کوشش کی۔ جنرل کو تشویش ہے کہ نئی پارلیمنٹ جس کا اس سال انتخاب ہونا ہے، اس کے سیاسی عزائم کے خلاف ہوگی۔ چنانچہ اس نے ایک انجینیرڈ ریفرنڈم کروایا جو اسے مزید پانچ سال کے لیے صدر بنوا دے لیکن انتخابی مہم اتنی کھلی کھلی بوگس تھی کہ اس کا امکان ہے کہ مشرف کے لیے اندرون و بیرون ملک جو حمایت تھی وہ ختم ہو جائے۔

> کسی کو بھی توقع نہیں تھی کہ حزب اختلاف کی قوتیں کوئی بڑا چیلنج کھڑا کر سکیں گی۔ اس لیے انھوں نے اس کا بائیکاٹ کیا اور مشرف کو اپنی ۹۸ فی صد کی فتح پر ایک بے شرم آمر کی طرح شیخی بگھارنے کے لیے چھوڑ دیا۔

خود امریکہ سے مقتدر حلقے وہ سوال اٹھانے لگے ہیں جو نیویارک ٹائمز کی ۳ مئی ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں اسکے مضمون نگار نیکولس کرسٹوف نے اٹھایا ہے:

> اس دھاندلی پر مبنی ریفرنڈم میں ہماری شمولیت سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمہوریت کیا ہے؟

ہم نے صرف چند اقتباسات یہاں پیش کیے ہیں ورنہ دنیا کا کوئی اہم پرچہ اور کوئی قابل ذکر حلقہ ایسا نہیں ہے جہاں اس ریفرنڈم پر تین حرف نہ بھیجے جا رہے ہوں اور صدر مملکت کی آبروباختی کے چرچے نہ ہوں۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون!

خدشات و امکانات

ریفرنڈم کی جس شرم ناک انداز میں اجتماعی آبروریزی کی گئی ہے اس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے، کم ہے لیکن ۳۰ اپریل نے پاکستان کی سیاست کو اسی طرح ہلا کر رکھ دیا ہے جس طرح ۱۱ ستمبر نے امریکہ کو ہلا ڈالا تھا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے ان چند پہلوؤں کی نشان دہی کر دی جائے جو وسیع تر قومی تناظر میں اس شر کے پردے سے ظاہر ہو رہے ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جنرل پرویز مشرف نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے اور جو کام حزب اختلاف نہ کر سکی وہ اس ریفرنڈم کے ذریعے غیب کی قوتوں نے خود ان سے کرا ڈالا ہے۔ ان کی ذات کو خصوصیت سے ان کی صاف گوئی، حق پروری، پاک دامنی، بے نفسی اور پاکستانیت کے ناطے سے جو بھی عزت، قبولیت اور ساکھ حاصل تھی اس کا آبگینہ پاش پاش ہو گیا ہے۔ عزت اور قبولیت بھی عفت کی مانند ہے۔ یہ شیشہ ایک ہی بار چور چور ہوتا ہے اور ہم بڑے بوجھل دل کے ساتھ یہ بات کہہ رہے

ہیں کہ قدرت کی طرف سے خود ان کے لیے یہ ایک تازیانۂ عبرت ہے۔ انھوں نے جس غرور و تکبر کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا، جس طرح وہ سیکولرازم اور کمال ازم کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے، سیکولر مسلم ملک کی بات ہر تردید کے باوجود ان کے افکار و اعمال سے چپک گئی تھی۔ مخلوط انتخاب، ختم نبوتؐ کے اعلان نامے کی تنسیخ، ناموس رسالتؐ کے قانون پر نظرثانی کی باتیں، حدود قوانین کو نشانۂ تنقید بنانے والوں کی حوصلہ افزائی، امریکہ کی سامراجی قیادت کے ظالمانہ اور جارحانہ اقدامات میں تعاون اور بے گناہوں کے جان، مال اور عزت کی بربادی میں شرکت وہ چیزیں ہیں جو اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی ہیں، اور قدرت کے اپنے قوانین اور اسالیب ہیں جن سے وہ ظلم کی طرف بڑھنے والوں اور ظالموں کا ساتھ دینے والوں کی بے وقعتی کا سامان کرتی ہے۔ ریفرنڈم نے ایک ایسی ہی رو سے اس ملک کو بچانے کا سامان کیا ہے اور ان چہروں، ان عزائم اور ان حرکات کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے جو ''سب سے پہلے پاکستان'' اور پاک دامنی کے خوش نما پردوں کے پیچھے اس ملک اور ملت اسلامیہ کی بنیادوں کی بیخ کنی کے درپے تھیں۔ یہ ایک فیصلہ کن موڑ ہے جو قوم کے ضمیر کو بیدار کرنے اور اسے پاکستان اور اس کے نظریے کی حفاظت کے لیے سرگرم عمل کرے گا۔

اس ریفرنڈم نے قوم کے مقتدر طبقے اور خصوصیت سے سول اور عسکری قیادت کی اصل اخلاقی حالت پر سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے اور ہر ہر فرد اور ہر ہر گھر اور ہر ہر ادارے میں لوگوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ لوگ ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے کس حد تک جانے کو تیار ہیں۔ اسلام تو نام ہی حدود کی پاسداری کا ہے لیکن جمہوریت کا بھی یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ restraint on power کے بغیر کوئی جمہوری نظام نہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے۔ یہی جمہوریت کا اصل جوہر ہے اور تمام حدود کو توڑ کر اس قیادت نے اپنا اصل چہرہ خود قوم اور دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے۔ اب اس کے پاس لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا۔

ریفرنڈم کے ان نتائج نے اور ان کی وجہ سے عالمی ساکھ پر جو ضرب پڑی ہے

اس نے جنرل پرویز مشرف اور ان کی ٹیم کو عالمی بلیک میل کے لیے اور بھی زیادہ نرم چارہ (vulnerable) بنا دیا ہے جو قوم کے لیے ایک خطرے کی گھنٹی ہے۔ ہمیں خطرہ ہے امریکہ تو اس کی بنا پر جو leverage استعمال کرے گا وہ کرے ہی گا' مگر بھارت بھی اس دوڑ میں پیچھے نہیں رہے گا اور جو کچھ ہماری سرحدوں پر اس وقت کیا جا رہا ہے اسے اس تناظر سے ہٹ کر نہیں دیکھا جا سکتا۔

فوجی قیادت نے ملک میں چار بار اقتدار سنبھالا اور ایک ہی دعوے کے ساتھ سنبھالا کہ سیاست دانوں کے گند سے نجات دلائیں گے مگر بد قسمتی سے ملک کو کچھ زیادہ ہی گند کی دلدل میں دھنسا کر وہ حادثے یا بے عزتی سے رخصت ہوئے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان ۱۰ سال ''اصلاح'' کا ڈراما کرتے رہے اور پھر رسوا ہو کر رخصت ہوئے۔ جنرل یحییٰ خان نے ملک کو بھی دولخت کیا اور خود بھی عبرت اور ذلت کا نشان بنے۔ جنرل ضیاالحق کا انجام اتنا برا نہ ہوا مگر عزت و وقار نہ ان کو حاصل ہوا اور نہ ان کے لائے ہوئے نظام کو۔ اور جنرل پرویز مشرف تو ۳۰ مہینے ہی میں اس ریفرنڈم کے ہاتھوں اپنے زوال کے خود ہی مصنف بن گئے ہیں۔ اب نہ عوام میں ان کی ساکھ بحال ہو سکتی ہے اور نہ فوج اور سول کے وہ افراد ان کی عزت کر سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ ان کے لیے وہ کس کس بداخلاقی اور بدعنوانی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انسان مجبوری میں غلط کام کر تو لیتا ہے مگر ضمیر کی ملامت پھر اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی --- اور عزت اور عفت تو وہ نازک چیزیں ہیں جو نہ جبر سے حاصل ہوتی ہیں اور نہ رشوت سے!

ریفرنڈم کا یہ پہلو قانونی اور سیاسی پہلو سے بھی زیادہ اہم ہے' اور جن قوتوں کو اخلاق کے میدان میں شکست فاش ہوئی ہو وہ پھر سر نہیں اٹھا سکتیں۔ اب وہ زوال کی آہنی گرفت میں ہیں اور وقت کا قاضی اپنا فیصلہ لازماً لکھے گا اور اس پر عمل بھی کرائے گا۔ نجات کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے اللہ سے توبہ واستغفار --- انفرادی بھی اور اجتماعی بھی۔ قیادت کی تبدیلی اب ایک سیاسی ہی نہیں' اخلاقی ضرورت (impation) ہے اور یہی اللہ کا قانون اور تاریخ کا سبق ہے۔

اصلاحات کے تسلسل کا غلط تصور

تاریخ اور سپریم کورٹ نے جو موقع موجودہ قیادت کو دیا تھا اس نے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کی ۳۰ ماہ کی کارکردگی بحیثیت مجموعی بے حد مایوس کن ہے۔ اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے ’’اصلاحات کے تسلسل‘‘ کا افسانہ تراشا اور ریفرنڈم کو اس کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ریفرنڈم میں تو وہ ناکام رہی لیکن اصلاحات اور ان کے تسلسل کی باتیں ابھی ہو رہی ہیں اور اس کے لیے سیاسی جوڑ توڑ اور صف بندی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ’’اصلاحات‘‘ اور ان کے ’’تسلسل‘‘ کے وعدوں کا بھی بے لاگ جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ جنرل پرویز مشرف اور ان کی ٹیم نے ملک کو کیا دیا ہے اور کس چیز سے محروم کیا ہے۔ ہم اس جائزے میں صرف حقائق اور دلائل تک اپنی بات کو محدود رکھیں گے۔ ذاتیات کبھی بھی ہماری دل چسپی کا موضوع نہیں رہے اور نہ ہم نیتوں کی بات کرتے ہیں۔ ان کا محاکمہ صرف اللہ تعالیٰ کر سکتا ہے اور وہ ضرور ہم سب کی نیتوں اور اعمال کا پورا پورا محاسبہ کرے گا۔ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ **لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ○** (الانفال ۸:۸) ’’تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے‘ خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو‘‘۔ **اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○** (یونس ۱۰:۵۵) ’’سن رکھو! اللہ کا وعدہ سچا ہے مگر اکثر انسان جانتے نہیں‘‘۔

کسی بھی اصلاح کے لیے تسلسل کی ضمانت کا انحصار تین چیزوں پر ہوتا ہے۔ پہلی یہ کہ وہ اصلاح فی نفسہ کتنی اچھی‘ درست اور ضروری ہے‘ کہاں تک حقیقت سے مطابقت رکھتی ہے‘ مرض کی صحیح تشخیص پر منحصر ہے اور علاج کا صحیح نسخہ تجویز کرتی ہے۔ اگر اصلاح صرف نام کی اصلاح ہو اور حق پر مبنی نہ ہو تو کچھ دیر تو اس کا بھرم رہ سکتا ہے‘ بالآخر وہ پادر ہوا ہو جاتی ہے۔ دوسری چیز اس کی قبولیت (acceptablity) ہے‘ یعنی کہاں تک اسے ان لوگوں کی رضا اور اعتماد حاصل ہے جن پر اس اصلاح کا اطلاق کیا جا رہا

ہے۔ جمہوریت نے اس کے حصول کا ذریعہ عوام کی مرضی اور تائید حاصل کرنے کا درست نظام قائم کیا ہے جو no texation without representation (نمایندگی کے بغیر کسی ٹیکس کا جواز نہیں)، بار بار کے انتخابات، ان میں پالیسیوں کی تائید کا حصول (منشور کے ذریعے) اور رائے عامہ کے جائزوں (public opinion) سے عبارت ہے۔ اسلام نے ان کے ساتھ ایک بنیادی چیز کا اضافہ کیا جو ایمان اور اس شریعت سے مطابقت کا راستہ ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس سلسلے کی تیسری اور آخری چیز محض فرد نہیں بلکہ ایسے اداروں اور طریق کار (processses) کا قیام ہے جن کے ذریعے صحت مند اور جان دار پالیسیاں افراد کی آمدورفت کے باوجود جاری رہ سکیں اور افراد اور اداروں میں ہم آہنگی رہے۔

پالیسیوں میں تسلسل کے نام پر جس طرح ایک شخص کو محور بنایا جا رہا ہے اور اس کی مدت اقتدار کو ان کے مدار مہام کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے، یہ بات ہی سرے سے غلط ہے۔ ہر انسان فانی ہے اور فانی انسانوں پر کسی تسلسل کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ بودا سہارا ہے۔ اسلام نے تو رسول تک کی ذات کو تسلسل کا مدار نہیں بنایا۔ اس پر ایمان اور اس کی سنت کو جو ایک طریقہ (process) ہے تسلسل کا دائمی ذریعہ بنایا۔ قرآن نے اس اصول کو یوں بیان کر دیا کہ:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ○ (آل عمرٰن ۳:۱۴۴) محمدؐ اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو اُلٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انھیں وہ اس کی جزا دے گا۔

یہی وہ آیت مبارکہ ہے جس کی تلاوت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضور اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے وصال کے وقت کی اور اُمت کو طریق بندی کے تسلسل کی تعلیم دی۔ وہ دن اور آج کا دن، سنت رسولؐ نے یہ اصول محکم کر دیا کہ اصلاح کا تسلسل process کے ذریعے ہوتا ہے اور اسوہ رسولؐ کا اتباع اور ایسے اداروں کا قیام جو اصلاح کو نشان راہ بنا دیں، ہی تسلسل کا صحیح ذریعہ ہیں۔ آج کی دنیا میں ملک کا دستور، قانون، روایات، پالیسی کے خطوط کار کا تعین وہ فریم ورک فراہم کرتے ہیں جن کے ذریعے پالیسیوں کا تسلسل حاصل کیا جاتا ہے۔ سیاست میں افراد کی جگہ پارٹیوں کا وجود بھی اس کا تقاضا ہے کہ افراد کے بدل جانے کے باوجود پارٹیاں باقی رہتی ہیں اور تسلسل اور جواب دہی دونوں جاری و ساری رہ سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں جو بھی اصلاح کے لیے اٹھتا ہے وہ دستور، قانون اور روایات ہی کو پہلے نشانہ بناتا ہے، اپنی ذات میں تسلسل کو مرکوز کرنا چاہتا ہے اور اسی طرح اداروں اور processes کے استحکام کو مجروح کر کے بے یقینی اور بے راہ روی کو رواج دیتا ہے۔ اگر پالیسیوں کے تسلسل کے لیے کسی خاص فرد پر انحصار ضروری ہوتا تو پھر نظام حکومت میں وقت کے تعین سے عہدوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر پارلیمنٹ چند سال کے لیے کیوں ہو؟ پھر صدر مملکت کے لیے ایک یا دو مدت کی حد کیوں رکھی جائے؟ پھر فوج کے سربراہ کے لیے تین سال کی مدت کیوں رکھی جائے؟ پھر ایک خاص مدت کے بعد اہم عہدوں پر فائز افراد کا تبادلہ کیوں ہو؟ تسلسل کا جو تصور آج پیش کیا جا رہا ہے، یہ آمریت کی راہ ہموار کرنے والا ہے۔ اسے اسلام یا جمہوریت کے معروف اصولوں سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ یہ عقل اور تجربے سے مطابقت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قوم کو ایسے تصورِ تسلسل اور ایسے اصولِ وحدتِ حکم (unity of command) سے محفوظ رکھے!

یہ تو تھی اصولی بات۔ رہا معاملہ ان افراد کا جو ''پالیسی کے تسلسل'' کے لیے اپنے اقتدار کے تسلسل کی ضمانت چاہتے ہیں، ان کے اپنے پالیسی کے امور میں تسلسل کا ریکارڈ کچھ امید افزا نہیں۔

گزشتہ ۳۰ ماہ میں پالیسی کے جتنے یوٹرن ہوئے ہیں اگر ان کا احاطہ کیا جائے تو

’’دور تک ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا‘‘ کا سماں نظر آئے گا۔ بھارت سے دوستی اور بھارت کو شٹ اپ (shut up) کہنے کا سلسلہ تو روزمرہ کا مقام حاصل کر چکا ہے۔ افغان پالیسی کا یوٹرن ایک کلاسک حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ کبھی قائداعظم کی قیادت کی باتیں ہوتی ہیں اور کبھی کمال اتاترک کے ماڈل کی؛ توہین رسالتؐ کے باب میں بھی بہت سی کروٹیں لی گئی ہیں۔ نواز شریف اور بے نظیر کو کیفر کردار تک پہنچانے کی باتیں بھی ہوئی ہیں اور ان سے معاملے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ایم کیو ایم سے معانقہ اور مخاصمہ دونوں چل رہے ہیں۔ کبھی کاروباری طبقے سے جنگ لڑی جاتی ہے اور کبھی رعایات اور شیر و شکر ہونے کی باتیں کی جاتی ہیں۔

احتساب کی وادی میں کتنے تسلسل کے نشانات ہیں اور کتنے سفر معکوس کے--- ان کا ذکر نہ ہی کیا جائے تو بہتر ہے۔ اور بات اب کشمیر اور جہاد کشمیر تک آتی نظر آ رہی ہے۔ کبھی اقوام عالم کے سامنے کہا جا رہا تھا کہ جہاد اور دہشت گردی میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اب اپنی زمین پر جہادی قوتوں کا ناطقہ بند کیا جا رہا ہے کہ آسمان گریہ کناں ہے۔ اگر پالیسیوں کا تسلسل انھی ہاتھوں قائم ہونا ہے تو پھر یہی کہنا پڑے گا کہ ’’ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں!‘‘

نئی پالیسیوں اور اصلاحات کی حقیقت

تسلسل کی بات تو ہم نے کی لیکن کچھ ذکر پالیسیوں کا بھی ہو جائے تو بہتر ہے۔ ہم نے جنرل ایوب کے اعلانات سے لے کر جنرل پرویز مشرف کے اعلانات کا بغور جائزہ لیا ہے اور ہمیں پوری کاوش کے باوجود بھی کسی نئی پالیسی اور اصلاح کا سراغ نہ مل سکا۔ جو زبان، جنرل ایوب، جنرل یحییٰ اور جنرل ضیاالحق نے استعمال کی ہے وہی جنرل پرویز مشرف استعمال کر رہے ہیں، وہی سیاست دانوں پر تنقید، وہی سول نظام کے ناکافی ہونے کی باتیں، وہی بنیادی اور زمینی جمہوریت کا وعظ، وہی احتساب کی لن ترانی--- ایبڈو (EBDO) سے نیب (NAB) تک! وہی معاشی ترقی کی تلاش اور دعوے، وہی

اچھی حکمرانی کے افسانے، وہی بیرونی دوستیوں اور بڑی طاقتوں سے رشتہ استوار کرنے کی کوششیں۔ اگر جنرل پرویز مشرف کی تقاریر اور جنرل ایوب کے ارشادات اور خصوصیت سے ان کی کتاب فرینڈز ناٹ ماسٹرز کا تقابل کیا جائے تو الفاظ و معانی میں ہر دو اعتبار سے اتنی یک رنگی نظر آتی ہے کہ ''من دیگرم تو دیگری'' کا کوئی مغالطہ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم باب وار جملوں کے حوالوں سے ان مماثلات کے انبار لگا سکتے ہیں اور جو بھی ان دونوں کا مطالعہ کرے وہ اس سے بے حد محظوظ ہو سکتا ہے۔ پھر نئی پالیسی اور ''نئی اصلاح'' پر کیسے اعتبار کیا جائے؟

وہی منزلیں وہی قافلے وہی راستے وہی مرحلے
مگر اپنے اپنے مقام پر کبھی ہم نہیں کبھی تم نہیں

اگر نئے اور پرانے کی بات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے اور خود جنرل پرویز کے دست راست، یعنی ان کے وزیر خزانہ کا ارشاد ہے کہ دانا لوگ نئے اور پرانے کے جھگڑے میں نہیں پڑتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ صحیح اور غلط کیا ہے:

> میرا خیال ہے کہ ہمیں اتنا بالغ نظر ہونا چاہیے کہ ان تصورات سے آزاد ہو جائیں کہ کیا نیا ہے اور کیا پرانا ہے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے لیے اچھائی کس میں ہے۔ اگر یہ پہلے کیا گیا ہے تو کیا ہوا۔ آیئے، اس کو اور زیادہ کریں۔ کسی تصور کو مناسب انداز سے نافذ کرنے کی اصل کلید یہی ہے۔
>
> (ماہنامہ ہیرالڈ، جنوری ۲۰۰۲ء، ص ۹۳)

جنرل صاحب نے اپنے ریفرنڈم کی مہم میں اپنے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے سات نکاتی ایجنڈے کو مرکزی اہمیت دی ہے اور اپنی اصلاحات اور کارناموں کا ذکر بڑے دعوے کے ساتھ کیا ہے۔ ہم صرف ان کے مرکزی نوعیت کے وعدوں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جن کو جاری رکھنے کے لیے وہ حاصل شدہ تین سالوں پر فی الحال مزید پانچ سال کا اضافہ چاہتے ہیں۔

امن وامان کی مخدوش صورت حال

سب سے پہلی چیز امن وامان اور جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا مسئلہ ہے۔ یہ ہر حکومت کا اولیں فرض ہے لیکن فوجی حکومت کا تو سب سے مضبوط یا سب سے کمزور پہلو امن وامان کے باب میں اس کا ریکارڈ ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ایک عام پاکستانی اور پاکستان میں آنے والا ہر غیر ملکی اپنے کو جتنا غیر محفوظ پاتا ہے، پہلے کبھی ایسا نہیں تھا۔ لا اینڈ آرڈر کی حالت ماقبل کے ادوار میں بھی مخدوش رہی لیکن فوجی حکومت نہ صرف حالات کو بہتر نہیں کر سکی بلکہ اس کے دور میں لاقانونیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

صرف چند حقائق صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرنے کے لیے قابل غور ہیں۔

کراچی میں لاقانونیت کس انتہا کو پہنچ چکی ہے، ۸ مئی ۲۰۰۲ء کا واقعہ جس میں ۱۴ افراد ہلاک ہوئے اور جس کے نتیجے میں پاکستان نیوی کا ایک اہم دفاعی منصوبہ التوا کا شکار ہو گیا ہے، اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈینیل پرل کا واقعہ کراچی میں اور اسلام آباد میں سفارتی علاقے میں چرچ پر حملہ ساری دنیا میں پاکستان کا منہ کالا کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ کراچی میں پچھلے چند سال میں ۱۸۲ افراد کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر قتل کیا گیا ہے اور جن ۲۹۸ افراد کو شبہے میں گرفتار کیا گیا ان میں سے صرف دو کو سزا ہوئی ہے، باقی سارے کیس معما بنے ہوئے ہیں۔ ۹۰ ڈاکٹروں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر احتجاج میں ہڑتال کر رہے ہیں اور امریکہ میں پاکستانی ڈاکٹر تفتیش کے سارے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں مگر نہ کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے اور نہ یہ سلسلہ بند ہوتا ہے۔ سندھ میں سالانہ ۱۰۰ افراد اغوا کیے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے زمین دار اس کی پشت پر ہیں لیکن قانون کا ہاتھ کسی کو گرفت میں نہیں لے پاتا۔

ایک جائزے کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۹ء سے وسط ۲۰۰۱ء تک ملک میں ۱۲۷ دہشت گردی کے واقعات ہوئے ہیں جن میں ۴۵۷ افراد جاں بحق ہوئے مگر نام نہاد

مقابلے میں چند افراد کے مارے جانے کے سوا کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا۔ پنجاب میں ایک مطالعے کے مطابق ہر ڈیڑھ منٹ میں اوسطاً ایک جرم واقع ہو رہا ہے۔ ہر ایک گھنٹے اور ۴۳ منٹ کے بعد ایک قتل کا واقعہ رونما ہو رہا ہے اور ۲۰۰۰ء میں ۴ ہزار ۳ سو ۲۹ کے مقابلے میں ۲۰۰۱ء میں ۴ ہزار ۶ سو ۱۳ جرائم وقوع پذیر ہوئے۔ اقدامات قتل بھی ۵ ہزار ۶ سو ۳۳ کے مقابلے میں ۵ ہزار ۶ سو ۴۹ ہوئے ہیں۔ ہر ۲۶ منٹ میں ایک شخص پر حملہ ہوا ہے جس میں وہ مجروح ہوا ہے۔ ہر آٹھ گھنٹے میں ایک سرکاری ملازم پر حملہ ہوا ہے اور ہر چار گھنٹے میں ایک خاتون کی عصمت لوٹی گئی ہے۔ اغوا کی واردات ہر ۴۵ منٹ پر واقع ہوئی اور ہر گھنٹے بعد ایک ڈاکا پڑا ہے۔ (ہفت روزہ انڈی پنڈنٹ، ۲۶ دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۳)

یہ ہے ملک کے سب سے بڑے صوبے کی صورت حال۔ لاہور میں روزانہ سات اور کراچی میں ۲۴ گاڑیاں چھینی جا رہی ہیں۔ کراچی میں صرف ایک سال میں ایک ہزار گاڑیاں اٹھائی گئیں۔ پولیس جو قانون کو نافذ کرنے والی اور عوام کی محافظ ہے جرائم کی سرپرست ہی نہیں خود ان کا ارتکاب کرنے میں مصروف ہے۔ سرکاری اعداد و شمار ایک ہوش ربا صورت حال کا پتا دیتے ہیں اور حکمران ہیں کہ لا اینڈ آرڈر پر قابو پا لینے کے دعوے کر رہے ہیں۔ (انڈی پنڈنٹ، ۵ دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۱۰)

پنجاب پولیس کی کارکردگی کی جو رپورٹ انڈی پنڈنٹ میں شائع ہوئی ہے اس کی رو سے پنجاب پولیس کے کل عملے کا ۳۵ فی صد اور لاہور ڈسٹرکٹ پولیس کا ۴۱ فی صد بدعنوانی اور جرائم کا مرتکب ہے۔ ۲۰۰۱ء کے پہلے نو مہینے میں پنجاب پولیس کی ۹۸ ہزار نفری میں سے ۳۴ ہزار ۵ سو ایک کسی نہ کسی جرم یا بدعنوانی کے مرتکب رہے ہیں اور لاہور پولیس کی ۱۶ ہزار نفری میں سے ۶ ہزار ۵ سو ۱۴ کو کسی نہ کسی جرم میں سزا دی گئی ہے۔ معاملہ محض نیچے کے عملے کا نہیں۔ جرم کا ارتکاب کرنے والوں میں چار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، ۸۲۸ انسپکٹر، ۲ ہزار ۷ سو ۲۳ سب انسپکٹر، ۳ ہزار ۸ سو ۳۷ اسسٹنٹ سب انسپکٹر، ایک ہزار ۷ سو ۵۰ ہیڈ کانسٹیبل اور ۲۵ ہزار ۳ سو ۲۳ کانسٹیبل شامل تھے۔ یہ وہ

افراد ہیں جن کی گرفت ہو سکی --- قیاس کن زگلستان من بہار مرا!

پھر اگر امن و امان کا وہ حال نہ ہو جو ہے تو کیا ہو۔ پولیس اصلاحات کی بڑی باتیں ہو رہی ہیں لیکن جو کچھ سامنے آ رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ظالم اور کرپٹ پولیس کے اختیارات میں اضافہ ہو رہا ہے اور توازن کا جو نظام بصورت پبلک سیفٹی کمیشن تجویز کیا جا رہا ہے وہ اول تو وجود میں نہیں آ رہا' اس کے اختیارات محدود ہیں اور پھر اطلاعات ہیں کہ جہاں کہیں وہ بنائے جا رہے ہیں ان کے لیے جو نام آ رہے ہیں ان میں بڑی تعداد خود مجرموں کی ہے (دی نیوز' ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء) ۲۹

جیلوں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد جس طرح جرم کی طرف جا رہی ہے اور بحیثیت مجموعی ملک میں قانون کا احترام جس طرح ختم ہو رہا ہے وہ ہولناک ہے۔ جب دستور اور قانون کا حلف اٹھانے والے اور ان کے نفاذ کے ذمہ داران ہی ان کا احترام نہیں کرتے تو معاشرہ تباہ حال نہ ہو تو کیا ہو۔

کراچی میں فرقہ وارانہ ہلاکتوں کی تفصیل نیوز لائن (مئی ۲۰۰۲ء) نے دی ہے جس سے گذشتہ پانچ سال' خصوصیت سے پچھلے تین سال میں قانون کی گرفت کے ڈھیلے ہونے اور خون مسلم کی ارزانی میں اضافے کی تصویر سامنے آتی ہے: ۱۹۹۸ء میں ۵' ۱۹۹۹ء میں ۱۲' ۲۰۰۰ء میں ۱۸' ۲۰۰۱ء میں ۵۸' ۲۰۰۲ء (جنوری/اپریل) میں ۲۲۔

لاہور جیسے شہر میں خود فوج کے زیر ملازمت اور ریٹائرڈ ارکان پر حملوں کی رپورٹ امن و امان کی مخدوش صورت حال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ۲۰۰۱ء کے پہلے ۱۰ مہینوں میں صرف لاہور میں ۳۰ فوجی نشانہ بنے جن میں جنرل' بریگیڈیئر' کرنل اور میجر کے درجے کے افسران شامل ہیں۔ (انڈی پنڈنٹ ۲۱ نومبر ۲۰۰۱ء' ص ۴)

لیکن اس سلسلے کی سب سے ہولناک اور ہوش ربا صورت حال' حال ہی میں شائع ہونے والی ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ انٹرنیشنل (SAPI) کی رپورٹ ہے جس میں پاکستان سمیت کئی ممالک میں بچوں سے زیادتی کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور اس کی رو سے ۲۰۰۰ء میں ۱۹۹۹ء کے مقابلے میں پاکستان میں بچوں سے جنسی زیادتی

کے واقعات میں ۳۹ فی صد کا اضافہ ہوا ہے، یعنی ۹۴۵ کے مقابلے میں ایک ہزار ۳ سو ۱۷۔ ان ظلم کا نشانہ بننے والوں میں سے ۶۰ فی صد لڑکیاں ہیں۔ رپورٹ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ رپورٹ کیے جانے والے واقعات اصل واقعات کا صرف ۱۰ فی صد ہیں۔

اگر فوجی حکومت کے دور میں امن و امان اور جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا یہ حال ہے تو اس پر جنرل پرویز مشرف اور جنرل معین حیدر کو شرمسار ہونا چاہیے نہ کہ اسے کارکردگی اور کارنامے کی فہرست میں کوئی جگہ دی جائے۔

نیب کی کارگزاری

اس حکومت کا دوسرا ''کارنامہ'' احتساب کا نظام ہے۔ آیئے اس کی کارکردگی کا بھی مختصر جائزہ لیں۔

نیشنل اکاؤنٹیبلٹی بیورو، نیب (National Accountability Bureau) کو گذشتہ ۳۰ ماہ میں تین سربراہان کی قیادت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہاں تسلسل کے اصول کی ضرورت محسوس کی گئی اور نہ پالیسی کے اصولوں کی۔ پہلے دعویٰ تھا کہ احتساب بلاتخصیص ہوگا۔ پھر جرنیلوں اور ججوں کو دائرے سے باہر رکھنے کا اعلان ہوا مگر جب اس پر ہر طرف سے واویلا مچا تو اشک شوئی کے لیے ان کو بھی دائرے میں رکھ لیا گیا۔

بیورو کی جو رپورٹ خود اس نے شائع کی ہے اس کی رو سے ادارے نے ایک ہزار ۴۳ کیس تحقیق کے لیے وصول کیے۔ ان ۳۰ ماہ میں صرف ۲۸۷ معاملات کی تفتیش مکمل ہو سکی ہے۔ گویا صرف ۲۷.۵ فی صد باقی ۶۶ فی صد ابھی زیر تفتیش ہیں۔ سیاست دانوں میں دو سابق وزرائے اعظم، ۱۳ وزرائے اعلیٰ، ۶۲ ارکان قومی اسمبلی اور ۱۰ سینیٹ کے ارکان ہیں اور ۱۰۸ کا تعلق صوبائی اسمبلیوں سے ہے۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد تقریباً دو تہائی اور ایک تہائی ہے۔

جن مقدمات کی تفتیش کی گئی ہے ان میں سے ۸۷ سے سودے بازی کے بعد

مک مکا ہو چکا ہے اور روایت یہ ہے کہ اس حربے کو سیاست دانوں کو ''ہم خیال'' بنانے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو' جب بھی یہ احتساب کے اصول کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا معمایہ ہے کہ خود میاں نواز شریف صاحب پر سارے دعووں اور مواد کی موجودگی کے باوجود مالی بدعنوانی اور قوم کو لوٹنے کے الزام پر مقدمہ نہیں چلایا گیا' بلکہ جہاز ہائی جیک کرنے اور ہیلی کاپٹر کے معاملات پر مقدمہ چلا اور پھر اس قدر سنگین بدعنوانیوں اور الزامات کے باوجود ان سے معاملات طے کر کے باہر بھیج دیا گیا۔ دونوں سابق وزرائے اعظم اور ان کے اہل خاندان کے علاوہ یہی کچھ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور سیاسی تجزیہ نگار صاف کہہ رہے ہیں کہ:

> نیب کے سیاست زدہ ہونے کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکمران نیب کو اپنے سیاسی مخالفین سے سمجھوتہ کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ جس طرح کچھ بہت ہی بدنام کرپٹ سیاست دانوں کو احتساب سے باہر رکھا گیا ہے' اس سے نیب کی انصاف پسندی پر شبہات وارد ہوتے ہیں۔
>
> (ہفت روزہ انڈی پنڈنٹ' ۲ جنوری ۲۰۰۲ء' ص ۶)

یہ بھی ایک معما ہے کہ گو نیب کا دعویٰ ہے کہ اس نے اب تک ۷۵.۵۹۶ ارب روپے کی بازیافت (recovery) کی ہے۔ لیکن سرکاری خزانے کو جو رقم عملاً منتقل کی گئی ہے وہ صرف ۱۱.۲ ارب روپے ہے' یعنی اکاؤنٹنٹ جنرل آف پاکستان نے صرف یہ رقم وصول کی ہے:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

نیب کی کارکردگی اور غیر جانب داری پر ایک بڑا دھبا وہ خط ہے جو اس کے سابق چیئرمین جنرل خالد مقبول نے اپنے نیب سے رخصت ہونے سے پہلے تین سروس چیفس کو لکھا تھا اور ایئر فورس کے دو سابق سربراہوں اور فوج کے ایک سابق سربراہ کے

دور میں ہونے والی سنگین بدعنوانیوں کی تحقیق کی اجازت چاہی تھی لیکن یہ اجازت نہ جنرل خالد مقبول کو ملی اور نہ ان کے جانشین کو (انڈی پنڈنٹ، ۹ اگست ۲۰۰۱ء، ص ۱)

جنرل پرویز مشرف کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اوپر کی سطح سے کرپشن ختم کر دی ہے۔ بظاہر ان کے وزرا کے بارے میں اس قسم کی چہ میگوئیاں نہیں ہو رہیں جو ماضی کی حکومتوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ لیکن ایک تو کرپشن صرف مالی سودوں اور کک بیکس کا نام نہیں، وسائل کا غلط استعمال جس شکل میں بھی ہو وہ کرپشن کے زمرے میں آتا ہے اور جو کچھ ریفرنڈم میں ہوا اسے کسی اور نام سے پکارا جانا ممکن نہیں۔ پھر بین الاقوامی سطح پر کرپشن کے ادراک کا جو نظام بھی ہے اس میں پاکستان کے مقام اور حیثیت میں نہ صرف یہ کہ کوئی بہتری نہیں آئی ہے بلکہ تازہ ترین رپورٹ جو ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے شائع کی ہے اس میں کرپشن کے اشاریے میں اضافہ آیا ہے۔ ۱۹۹۸ء کے اشاریے کی رو سے نیچے سے ہمارا نمبر ۱۱ تھا اور ۱۰ کے اسکیل میں ہمارا اسکور ۲.۷ تھا لیکن ۲۰۰۱ء کی رپورٹ میں نیچے سے اب ہمارا شمار صرف سات پر ہے اور اسکور بھی اور نیچے آ گیا ہے، یعنی ۲.۳۔

انفرادی واقعات کے بیان سے ہم نے ہمیشہ گریز کیا ہے لیکن صرف تذکیر اور انتباہ کے لیے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اخبارات میں ۲۸ ججوں کی فہرست آئی ہے جن کا تعلق سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ سے ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حلف نامہ دے کر انھوں نے ایک یا ایک سے زیادہ پلاٹ بلااستحقاق حاصل کیے ہیں (انڈی پنڈنٹ، ۲۴ دسمبر ۲۰۰۱ء، ص ۲۴)۔ لیکن احتساب کے نظام کو کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

دی ہیرالڈ اور دوسرے رسائل نے موجودہ حکومت کے دور میں ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ کے ادارے میں ۱.۴ ارب روپے کے خرد برد کی رپورٹیں شائع کی ہیں جو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی ۳۱ جنوری ۲۰۰۲ء کی میٹنگ میں سامنے آئی ہیں۔ قومی تعمیر نو بیورو کے چیئرمین اس نظام کا دماغ کہے جاتے ہیں، ان کے ایک کزن کموڈور سید طیب نقوی (چیئرمین کراچی فشریز ہاربر اتھارٹی کے) بارے میں لاکھوں کروڑوں کی کرپشن

کی شکایات حکومت سندھ کو دی گئی ہیں۔ اطلاع ہے کہ ان کے ہٹائے جانے کے احکام خود چیف ایگزیکٹو کی طرف سے جاری ہوئے مگر ان پر عمل روک دیا گیا (انڈی پنڈنٹ، ۳ اپریل، ۲۰۰۲ء، ص۴)۔ اور حال ہی میں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں نارکوٹکس بورڈ کے سربراہان کے جو وزرائے داخلہ ہوتے ہیں، وہاں کی گاڑیوں کے ناجائز استعمال کی رپورٹیں آئی ہیں اور اس میں سابقہ وزرائے داخلہ کے ساتھ موجودہ وزیر داخلہ کا نام بھی آتا ہے (دی نیشن، ۶ مئی ۲۰۰۲ء)۔

محکمہ خوراک میں کرپشن کے جو واقعات ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے مالی سال کے بارے میں سامنے آ رہے ہیں وہ ۳ ارب ۲ کروڑ روپے سے متجاوز ہیں۔ وزارت سیاحت میں ۹ کروڑ کے حسابات غائب ہیں (نوائے وقت، ۱۳ مئی ۲۰۰۲ء)۔ ادویات کی خرید میں ۹۱ کروڑ کی گڑبڑ کی بات بھی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے آئی ہے (دی نیشن، ۸ مئی ۲۰۰۲ء)۔

تقرریوں میں بھی من مانی کا اسی طرح رواج ہے حتیٰ کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے سابق ارکان کو جو قانوناً اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت میں کوئی تنخواہ والا کام نہیں کر سکتے، دھڑا دھڑ نوازا جا رہا ہے (دی نیوز، ۷ مئی ۲۰۰۲ء)۔ اس سال کی ورلڈ بنک کی کمیٹی نے جو رپورٹ مئی ۲۰۰۲ء میں دی ہے اور جسے بی بی سی نے سیربین کے پروگرام میں ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء کو نشر کیا ہے اس کے مطابق پاکستان میں تین سرکاری ادارے کرپشن کا گڑھ ہیں، یعنی سی بی آر، واپڈا اور کے ای ایس سی۔ اس سے پہلے خود وزارتِ خزانہ کی ٹیکس نظام میں اصلاحات کی ٹاسک فورس نے (ورلڈ بنک کے سابق نائب صدر شاہد حسین صاحب کی سربراہی میں) اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ سی بی آر، پولیس، ماتحت عدالتیں اور واپڈا کرپشن میں سب سے پیش پیش ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر جنرل صاحب کا دعویٰ ہے کہ کرپشن کا خاتمہ ہو گیا ہے تو ''ناطقہ سربگریباں ہے، اسے کیا کہیے''۔

وفاقیت کا اصول

جنرل صاحب نے وفاقی نظام کے استحکام اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی کی بات بھی کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فوجی حکومت اور وفاقیت کا اصول ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فوجی حکومت کے معنی ہی وحدت اختیار (unity of command) ہے۔ صوبے اپنی تمام خودمختاری سے محروم ہو جاتے ہیں اور صرف ایک شخص کی پالیسی ہر جگہ نافذ ہوتی ہے۔ پاکستان میں وفاقیت کے اصول کو جتنا نقصان فوجی ادوار میں پہنچا ہے اس کا شمار بھی مشکل ہے۔ فوجی اقتدار کے ۲۶ سال وفاق کے لیے سب سے تاریک سال رہے ہیں۔ لیپاپوتی اپنی جگہ لیکن آج بھی حقیقت ہے کہ مسئلہ پانی کی تقسیم کا ہو یا مالی وسائل میں شرکت کا، قرضوں کی بات ہو یا ان پر وصول کیے جانے والے سود کی، زمین کی تقسیم کی بات ہو یا ترقیاتی پروگراموں اور غربت مٹانے کے منصوبوں کے لیے وسائل کی فراہمی کی، چھوٹے صوبوں کی شکایات اس مقام پر پہنچ گئی ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک سرکاری اتھارٹی سے جو صدیوں سے سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے چھوٹے صوبوں کے نمایندوں نے واک آؤٹ کیا اور صدر کو مداخلت کرنا پڑی۔ تھل نہر کا مسئلہ بھی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ صوبوں کے درمیان متعدد امور پر شدید کشیدگی ہے۔ بلوچستان میں بار بار ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ قوم پرست عناصر کی بن آئی ہے اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد اور یو این او کی مداخلت کی باتیں کر رہے ہیں۔ صوبوں کے درمیان کش مکش ہی نہیں اب تو صوبے کی سول انتظامیہ اور کور کمانڈروں کے اختلافات بھی سامنے آ رہے ہیں اور صرف چھوٹے صوبوں میں ہی نہیں، خود پنجاب کے گورنر اور لاہور کے کور کمانڈر کے اختلافات اور اس کی بنیاد پر بیوروکریسی میں صف بندی سے سب واقف ہیں اور شفاف حکمرانی کی خیر منا رہے ہیں۔

اگر ان تمام امور سے صرف نظر کر لیا جائے اور ''سب اچھا ہے'' کی رٹ لگائی جاتی رہے تو اس سے زمینی حقائق تو تبدیل نہیں ہو جاتے۔ اختلافات کو افہام و تفہیم سے

دُور کرنے کے لیے نمائندہ حکومت اور جمہوری عمل سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں۔

معاشی ترقی کا سراب

جنرل مشرف نے اپنی معاشی اصلاحات اور کارکردگی کو ریفرنڈم کی مہم میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور ان کے ہم نوا اور ہم خیال بھی مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں اضافے اور بیرونی قرضوں اور امداد کے حصول کو بڑے فخر سے پیش کر رہے ہیں۔ ایک ”مذہبی بزرگ“ نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا ہے کہ معیشت کی کارکردگی کو جانچنے کے جتنے بھی اشارے (indicators) ہیں وہ سب مثبت اور روشن ہیں۔ ہم پورے ادب سے عرض کریں گے کہ حالات کی یہ تصویر کشی بڑی جزوی، اپنی پسند کی اور بڑی حد تک جانب داری پر مبنی ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ماضی کی سیاسی حکومتوں کی معاشی کارکردگی ہرگز قابل فخر نہ تھی اور وہ ملک کو مسلسل قرضوں کے شکنجوں میں کس رہی تھیں اور نفع عاجلہ کی خاطر حقیقی معاشی اصلاحات سے غافل تھیں لیکن ہمیں یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ موجودہ حکومت کی معاشی ٹیم نے بھی کسی بنیادی اصلاح کی فکر نہیں کی ہے۔ اس ٹیم پر بنک کاروں کا غلبہ ہے اور ہمیں احساس ہے کہ وہ اچھے بنک کار ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ملک کی معیشت صرف ایک بنک کی مانند نہیں۔ جب تک اصل معاشی مسائل کا حل تلاش نہ کیا جائے، معاملات سطحی رہیں گے اور مسائل و مشکلات گرفت میں نہیں آئیں گی۔

یہ صحیح ہے کہ ہوشیار بنک کاری اور قرض دینے والے آقاؤں کی نظر التفات کے باعث، مبادلہ خارجہ کی صورت حال میں نمایاں بہتری آئی ہے۔ ۱۹۹۹ء میں یہ ذخائر خطرناک حد تک کم ہو گئے تھے اور خصوصیت سے ۱۹۹۸ء کے بیرونی حسابات کو منجمد کرنے کے تباہ کن اقدام نے تو ساری دنیا میں ہماری ساکھ کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس میدان میں آج ہماری پوزیشن بہت بہتر ہے اور مئی ۲۰۰۲ء میں مبادلہ خارجہ کے ذخائر ۵.۳ ارب ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اس ایک اشارے سے جو نتائج نکالے جا رہے

ہیں اور جس طرح اس کا کریڈٹ لیا جا رہا ہے وہ حدِ انصاف سے متجاوز ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ توازنِ ادائیگی (balance of payments) گذشتہ ۲۰، ۲۵ سال میں پہلی مرتبہ ایک خاص حساب کے مطابق مثبت ہوا ہے، یعنی اگر حکومت کو ملنے والی رقوم (official transactions) کو شامل کر لیا جائے جو بیرونی ممالک سے عطیہ یا قرض ہیں تو توازن ادائیگی ۳۳۱ ملین کے نفع (surplus) میں آ جاتا ہے، اور اگر سرکاری ترسیل کو شامل نہ کیا جائے اور صرف تجارت اور دوسرے مالی transactions تک توازن ادائیگی کو محدود رکھا جائے تو خسارہ ۵۰۸ ملین ڈالر ہوتا ہے جو ماضی کے اوسطاً ۳ ارب ڈالر کے خسارے سے کہیں کم ہے۔ اس کا کریڈٹ صرف ایک حد تک حکومت کو جاتا ہے کیوں کہ اس کی اصل وجہ تجارت کے خسارے میں کمی ہے جو درآمدات میں کمی کی وجہ سے رونما ہوا ہے، برآمدات کے اضافے کی وجہ سے نہیں۔ نیز بیرون ملک پاکستانیوں کی ترسیلات میں دوگنا اضافہ، بین الاقوامی حالات، امریکہ میں پاکستانیوں کے سرمایے کے غیر محفوظ ہو جانے اور عرب امارات میں غیر سرکاری ترسیلات پر پابندی کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس ظاہری نفع کے پیچھے بڑے تلخ حقائق ہیں جن میں سب سے اہم چیز برآمدات کا جمود ہے۔ ۱۹۹۸ء سے قبل ملک کی برآمدات ۱۰ ارب ڈالر تک پہنچ رہی تھیں اور اس سال کے لیے بھی یہی ہدف تھا مگر عملاً پہلے ۱۰ مہینے میں ۷.۳۲۳ ارب ڈالر کی برآمدات ہوئی ہیں اور بہت زور لگایا تو توقع ہے ۸.۵ ارب اور ۹ ارب کے درمیان ہو سکیں گی، یعنی ہدف سے ۱۰ سے ۱۵ فی صد کم! چونکہ درآمدات میں کمی برآمدات میں کمی سے زیادہ ہوئی ہے، یعنی ۷.۱ فی صد کے مقابلے میں ۶.۹۳ فی صد، اسی لیے توازنِ تجارت کے خسارے میں کمی آ گئی ہے۔ اس کمی سے توازنِ ادائیگی اور مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں تو بہتری آئی ہے لیکن اسے معیشت کے لیے صحت مند قرار دینا معاشی اصولوں سے ناواقفیت کا ثبوت ہوگا۔

برآمدات میں کمی دراصل معیشت میں جمود اور پیداواری عمل میں سستی کا نتیجہ

ہے۔ قومی پیداواری شرح ترقی جو چھٹے منصوبے کے دوران (۱۹۸۳-۸۸ء)، ۶.۳ فی صد سالانہ تھی، ساتویں منصوبے (۱۹۸۸-۹۳ء) کے دوران ۴.۸ فی صد رہی اور آٹھویں منصوبے (۱۹۹۳-۹۸ء) کے دوران ۴.۲ فی صد ہوگئی، ۱۹۹۹-۲۰۰۱ء میں گھٹ کر ۳.۶ فی صد رہی اور اس سال ۲۰۰۱-۲۰۰۲ء کے بارے میں اندازہ ہے ۳ فی صد یا اس سے کچھ کم ہوگی۔ اسی طرح درآمدات میں کمی کا اثر بالآخر ملک کی پیداوار پر پڑے گا اور اس طرح خسارے میں یہ کمی کوئی نفع کا سودا نہیں۔ پھر اسٹیٹ بنک نے کھلی منڈی سے ڈالر خرید کر مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے مبادلہ خارجہ کو سہارا ضرور میسر آیا ہے اور ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت میں بھی استحکام آیا لیکن اس طرح جو ذخائر حاصل ہوئے ہیں وہ کسی پیدا آوری عمل کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کے حصول کے لیے جو ۲۰۰ ارب روپیا استعمال میں آیا ہے وہ ایک غیر پیدا آوری عمل کی نذر ہوگیا۔ اگر اسے ملک میں سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جاتا، تو یہ روزگار کی فراہمی، غربت کے خاتمے اور پیداوار کے اضافے میں مددگار ہوسکتا تھا۔

کسی ملک کی معیشت کو جانچنے کا صحیح معیار ملکی پیداوار میں اضافہ، برآمدات میں اضافہ، تقسیم دولت میں انصاف، روزگار کی فراہمی، فی کس آمدنی میں اضافہ، سرمایہ کاری میں اضافہ اور معیشت کے پھیلاؤ کے ساتھ ٹیکس کی آمدنی میں اضافہ ہے لیکن ان میں سے جو بھی اشارہ آپ لیں معیشت کی صورت حال اچھی نظر نہیں آئے گی۔ ملک میں سرمایہ کاری میں کمی آرہی ہے اور یہ شرح پچھلے چند سالوں میں قومی پیداوار کے ۱۷ اور ۱۸ فی صد سے کم ہوکر ۱۳ فی صد سے بھی کم رہ گئی ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری کی بڑی توقعات تھیں لیکن وہ بھی پوری نہیں ہوئیں۔ ۱۹۹۵-۹۶ء میں سالانہ بیرونی سرمایہ کاری ۱.۵ ارب ڈالر سے متجاوز ہوگئی تھی جو ۱۹۹۹ء میں ۶۰۰ ملین ڈالر پر آگئی تھی۔ ۲۰۰۰-۲۰۰۱ء میں یہ گر کر ۱۸۰ ملین ڈالر ہوگئی۔ سال رواں میں ۲۸۷ ملین ڈالر ہوئی ہے جو ۵۰۰ ملین کے ہدف سے بہت کم ہے۔

ملک میں پیداواری عمل میں سستی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے

کہ ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے مقابلے میں توانائی کے تجارتی استعمال میں کمی آئی اور سال رواں میں اس میں مزید کمی آئی ہے۔ یہی کیفیت گیس اور بجلی کے استعمال کی ہے۔ توانائی کے تمام وسائل کا یہی حال رہا ہے جو معیشت میں جمود اور سست روی کا ثبوت ہے۔ بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ زراعت شدید مشکلات سے دوچار ہے اور گنے اور چینی کی پیداوار اور ایک حد تک سیمنٹ کو چھوڑ کر زراعت اور صنعت دونوں کساد بازاری کا شکار ہیں۔ سوشل سیکٹر (تعلیم، صحت) اور پبلک سیکٹر میں ترقیاتی مصارف میں برابر کمی ہے اور نجی شعبے میں بھی کریڈٹ کا استعمال سال گذشتہ کے مقابلے میں تقریباً نصف ہے۔

یہ سب علامات معیشت میں جمود کی ہیں، افزونی کی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیکس سروے اور سی بی آر، حکومت اور فوج کی ساری ترک تازیوں کے باوجود ٹیکس سے حکومت کی آمدنی کا ہدف پورا نہیں ہو رہا۔ اس سال پانچ بار ہدف کو کم کیا گیا ہے جو ۴۵۷ ارب روپے سے کم کر کے اب ۴۱۴ ارب روپے پر لایا جا چکا ہے اور اندازہ ہے کہ عملاً ۴۰۰ یا زیادہ سے زیادہ ۴۰۴ ارب روپے حاصل ہوں گے جس سے بجٹ کا خسارہ ۶۰ ارب کی حد تک بڑھنے کا خطرہ ہے۔ اور یہ سب اس شہرہ عالم ٹیکس سروے کے بعد ہے جس نے حکومت اور اہل تجارت دونوں کے درمیان مہینوں جنگ کی کیفیت پیدا کر دی تھی، فوج بھی میدان میں اتار دی گئی تھی اور وعدے کیے جا رہے تھے کہ اب ٹیکس کی آمدنی میں بیش بہا اضافہ ہوگا، لیکن اگر معیشت میں نمو ہی نہ ہو، سرمایہ کاری ٹھٹھری ہوئی ہو، غربت میں اضافہ ہو رہا ہو، جو تمام عالمی اداروں کی رپورٹوں سے عیاں ہے تو خزانے میں اضافہ کیسے ہو؟ غربت میں اضافے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں آبادی کا ۱۷ فی صد خطِ افلاس سے نیچے تھا جو ۱۹۹۷ء میں ۳۷ فی صد اور ۲۰۰۱ء میں ۳۹ فی صد ہو گیا ہے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے فاقہ کشی سے ہونے والی اموات اور خودکشیاں پاکستان میں پہلی مرتبہ واقع ہو رہی ہیں۔

ملک میں فی کس آمدنی میں برابر کمی ہو رہی ہے اور پہلی بار ہماری فی کس آمدنی

بھارت میں فی کس آمدنی سے کم ہوگئی ہے۔ ۱۹۹۶-۹۷ء میں فی کس آمدنی ۴۹۳ ڈالر تھی جو ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء میں گھٹ کر ۴۴۶ ڈالر رہ گئی اور ۲۰۰۲ء میں یہ آمدنی صرف ۴۲۹ ڈالر ہے۔ ملکی پیداوار کی ترقی کی رفتار ۳.۸۹ فی صد سالانہ سے کم ہو کر ۲.۳۹ فی صد رہ گئی ہے اور بے روزگاری میں اضافہ لیبر فورس سے ۵.۸۹ فی صد سے بڑھ کر سال رواں میں ۷.۸۲ فی صد ہو گیا ہے۔ قومی بچت اور قومی سرمایہ کاری کی شرح میں بھی کمی ہوئی ہے۔ ملکی بچت ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء میں قومی پیداوار کا ۱۵.۴ فی صد تھیں جو ۲۰۰۰-۲۰۰۱ء میں کم ہو کر ۱۴.۵ رہ گئی اور سال رواں میں مزید کمی واقع ہوئی ہے۔ یہی حال سرمایہ کاری کا ہے جو ۱۹۹۹-۲۰۰۰ء میں قومی دولت کا ۱۵.۸ فی صد تھی مگر ۲۰۰۰-۲۰۰۱ء میں ۱۴.۹ فی صد اور اس سال اس سے بھی کم آ رہی ہے۔ (اسٹیٹ بنک کی سہ ماہی رپورٹ اور نیشنل بنک آف پاکستان کی رپورٹ' پاکستانی معیشت کے کلیدی اشارے' مارچ ۲۰۰۲ء)۔

مہنگائی کمر توڑ صورت اختیار کر گئی ہے۔ بجلی' گیس' پٹرول خصوصیت سے نشانہ ستم ہیں اور سال میں تین تین بار اور چار چار بار اضافہ ہو رہا ہے۔ تنخواہ دار اور کم آمدنی والے خاندان چیخ رہے ہیں' پنشن والے آہ و بکا کر رہے ہیں اور کوئی سننے والا نہیں۔ جب عالمی منڈیوں میں پٹرول کی قیمت کم ہوتی ہے تب بھی یہاں ڈیزل اور پٹرول کی قیمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ اس وقت بھی بجٹ سے پہلے ۱۷ فی صد تک کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور بلوچستان کے ٹرانسپورٹر ہڑتال کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

معیشت کی اس صورت حال کو کسی اعتبار سے بھی تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرضوں کے بار میں بھی عملاً اضافہ ہوا ہے گو اضافے کی رفتار میں کمی آئی ہے۔ یہ بیرونی ساہوکاروں کی نظر التفات اور سیاسی وجوہ سے اور قرضوں کی ری شیڈولنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔

غربت کے خاتمے اور منصفانہ اور خوش حال معاشرے کے قیام کے سلسلے میں کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوئی اور نہ سود کے خاتمے کے لیے کوئی قابل ذکر اقدام ہوا

ہے جس کے بارے میں سپریم کورٹ کی دی ہوئی مہلت ۳۰ جون ۲۰۰۲ء کو ختم ہو رہی ہے۔ اطلاعات یہی ہیں کہ اب پھر حکومت مزید وقت کے حصول یا سابقہ فیصلے کو کالعدم کرانے کی درخواست کرنے والی ہے۔ (ڈان‘ ۱۵ مئی ۲۰۰۲ء)

دنیا میں ہمارا مقام

جنرل صاحب کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی ساکھ دنیا میں بڑھی ہے‘ قوم میں اعتماد پیدا ہوا ہے اور ہم سر اٹھا کر چلنے کے لائق ہو گئے ہیں۔ کاش! حقیقت کی دنیا میں ایسا ہی ہوا ہوتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے بعد امریکہ نے ہمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے جنرل صاحب کو تعریف و توصیف کی رشوت تو بہت دی ہے مگر پاکستان نے سیاسی‘ عسکری‘ اخلاقی اور معاشی ہر اعتبار سے نقصان ہی نقصان اٹھایا ہے۔ ایک طرف ہزاروں معصوم انسانوں کے خونِ ناحق کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوئی‘ تو دوسری طرف ہماری اپنی آزادی اور خودمختاری پر شدید ضرب لگی ہے۔ آج ہماری سرزمین پر امریکی فوجوں کے چار اڈے قائم ہیں۔ ہمارے ہوائی اڈوں پر ان کے کمپیوٹر قابض ہیں اور ہر ہر فرد کے بارے میں ساری معلومات ان کی جھولی میں جا رہی ہیں۔ ہماری پولیس ان کی ایف بی آئی کے زیر تربیت ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کو جمہوریت کی تعلیم دینے کے لیے ۵۸ ملین ڈالر کا پروگرام شروع کر دیا گیا ہے۔ وزیرستان اور فیصل آباد میں ان کے کمانڈو ہماری پولیس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ امریکی سفیر دعویٰ کر رہی ہیں کہ اب ایف بی آئی کے ماہرین محض ہفتہ دو ہفتہ کے معاملے کے لیے نہیں آ رہے‘ بلکہ یہاں مستقل مقیم ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ کا افغانستان آپریشن کا کمانڈر کھلے بندوں اعلان کر رہا ہے کہ ’’پاکستان میں ہماری فوجیں اس وقت تک رہیں گی جب تک ہم اس کی ضرورت محسوس کریں گے‘‘۔

ہماری معیشت آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے ہاتھوں اس طرح گروی ہو گئی ہے کہ اب بجٹ قوم تو کیا‘ کابینہ کے سامنے آنے سے بھی پہلے عالمی بنک کے نمائندوں

سے منظور کرایا جاتا ہے اور ڈیفنس بجٹ، بجٹ کا خسارہ اور آمد و صرف کے تمام تخمینے بنک کے حکام کے ارشادات ہی نہیں احکامات کے مطابق طے ہو رہے ہیں۔ بیرونی ذرائع ابلاغ میں یہ بھی آ رہا ہے کہ ہماری فوجی نقل و حرکت اور نیوکلیر صلاحیت کی مکمل نگرانی کی جا رہی ہے اور اگر لبنان کے امریکی عیسائی مصنف فواد عجمی کا دعویٰ (ریڈرز ڈائجسٹ ، اپریل ۲۰۰۲ء) درست ہے تو اب ہماری ایٹمی تنصیبات امریکہ کی دسترس میں ہیں۔

اس پس منظر میں بھارت اور اسرائیل کا روز افزوں سیاسی اور عسکری تعاون، جنگی سازوسامان کی بھارت کو فراہمی اور بھارت اور امریکہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور مشترک فوجی مشقیں اور ''سرحدی دہشت گردی'' کے نام پر دونوں کا پاکستان کو بلیک میل کرنا اور بھارت کا ہماری سرحدوں پر چھ ماہ سے فوجوں کو تعینات کرنا اور ایسی مشقیں کرنا جن کی دھول ہماری سرحدوں تک پہنچ رہی ہے وہ خطرناک صورت حال ہے جس میں جنرل صاحب کی قیادت نے ملک کو لا پھنسایا ہے۔ ریفرنڈم میں اخلاقی دیوالیہ ہونے کے بعد، وہ امریکہ اور بھارت دونوں کے لیے زیادہ تر نوالہ بن گئے ہیں اور ان کی زدپذیری (vulnerability) میں خطرناک حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ امن اور عزت بھیک مانگ کر حاصل نہیں ہوتے، وہ تو عزم اور قوت بازو سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ تو رہ و رسم شہ بازی کی دنیا ہے۔ اس میں دشمن سے مصافحہ اور غیروں سے مصالحت سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔

کارگل کے موقع پر میاں نواز شریف اور صدر کلنٹن میں ہونے والی ملاقات کی تمام تفصیلات خاص طور پر اس موقع پر شائع کی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل وہی منظر دہرایا جا رہا ہے۔ پاکستانی قوم آج ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے جہاں اسے اپنی زندگی، آزادی اور عزت کے تحفظ کے لیے ایک بڑا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس وقت دونوں، یعنی ایک طرف جنرل پرویز مشرف اور پوری فوجی قیادت اور دوسری طرف ملک کی پوری دینی اور سیاسی قیادت ایک عظیم آزمائش سے دوچار ہیں۔ ریفرنڈم نے جنرل صاحب

کو کمزور کیا ہے، مضبوط نہیں۔ اور فوج کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی قوت کا راز قوم ہے کوئی اور نہیں۔ بھارت اپنی شاطرانہ چالیں بڑی ہوشیاری سے چل رہا ہے اور امریکہ اس کی پشت پر ہے۔ اگر ہم اس کھیل کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے تو یہ تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ قوم میں بڑی جان ہے اور اگر اللہ کی رسی کو تھام کر قوم کو ساتھ لیا جائے تو آج بھی ملک نہ صرف اپنا دفاع کر سکتا ہے، بلکہ دشمن کے دانت کھٹے کر سکتا ہے لیکن اس کے لیے ایمان، عزم اور قومی اتحاد اور یگانگت کی ضرورت ہے۔ دشمن کی پوری کوشش ہے (اور جن کو آپ دوست سمجھ رہے ہیں وہ اس کھیل میں برابر کے شریک ہیں) کہ پاکستانی قیادت کو دباؤ میں لا کر پاکستان کو اپنی کشمیر پالیسی کو بھی اسی طرح تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں جس طرح کارگل اور پھر افغانستان کی پالیسی کو تبدیل کرایا ہے۔ لیکن یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، سیاسی مصالح کا نہیں۔

پاکستان اور کشمیر ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔ اس میں کسی حصے کو پہلے اور کسی کو پیچھے نہیں کیا جا سکتا۔ کشمیر کی تحریک مزاحمت پاکستان کے دفاع کی تحریک ہے اور اس کا کمزور ہونا، پاکستان کا کمزور ہونا بلکہ بالآخر بھارت کے شکنجے میں گرفتار ہو جانے کے مترادف ہوگا۔ یہ وقت بالغ نظری سے دشمن کے کھیل کو سمجھ کر قوم کو اعتماد میں لینے اور قوم میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کا ہے۔ جس طرح سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں سے بجا طور پر مطالبہ ہوا ہے کہ اپنی ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کریں، اسی طرح فوجی قیادت کے لیے بھی ضروری ہے کہ سیاست میں فوج کی دراندازی کے جو تباہ کن نتائج رونما ہوئے ہیں ان کا اعتراف کرے اور اپنے اصل رول (دفاعِ وطن) کے لیے پورے طور پر یکسو ہو کر اس میں منہمک ہو جائے۔ نظامِ سیاست میں حصہ اور حق مانگنے کی باتیں نہ ملک کے مفاد میں ہیں اور نہ خود فوج اور اس کی دفاعی صلاحیت کے لیے مفید۔ اسے اپنے دائرے میں رہنا چاہیے تاکہ اسے اس کا حق مل سکے لیکن اس کا کوئی ایسا کردار نہیں جو اسے اقتدار میں شریک بنانے سے عبارت ہو۔ قائداعظمؒ اور ان کے تصور

پاکستان کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن قائد کے تصور سے کسی وفاداری کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔

قائداعظم کی ہدایات

آیئے اس سلسلے میں قائداعظمؒ کے محکم ارشادات کو کسی تحفظ کے بغیر قبول کریں اور بیوروکریسی اور فوج دونوں کو ان حدود کا پابند کریں جو ان کی کارکردگی کے لیے ضروری ہیں۔ اہل سیاست بھی اپنے طور طریقے درست کریں اور ایک نظام اخلاق کی پابندی کا عہد کریں اور بیوروکریسی اور فوج بھی اپنی حدود کی پابند ہو۔ قومی یک جہتی ہی کے لیے ضروری ہے کہ جلد از جلد انتخابات کا اہتمام کیا جائے اور حقیقی معنوں میں شفاف، آزاد اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے ملک میں نئی سیاسی قیادت کو زمامِ کار سونپی جائے تاکہ سب مل کر دستور کو اس کی صحیح اسپرٹ میں چلانے اور اس کا احترام کرنے کا عہد اور اہتمام کریں۔

قائداعظمؒ نے اس سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں وہ یہ ہیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ کے مقام پر سول حکام کو خطاب کرتے انھوں نے فرمایا:

> آپ کو اپنا فرض منصبی خادموں کی طرح انجام دینا ہے۔ آپ کو اِس سیاسی جماعت سے یا اُس سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ آپ کا کام نہیں، یہ سیاست دانوں کا کام ہے کہ وہ موجودہ آئین کے تحت یا آیندہ آئین، جو بالآخر تشکیل پائے گا، کے تحت اپنے موقف کے لیے لڑیں۔ لہٰذا آپ کا نہ اِس سیاسی جماعت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اُس سیاسی جماعت سے۔ آپ سرکاری ملازم ہیں۔ جس جماعت کو اکثریت حاصل ہوگی وہ حکومت بنائے گی اور آپ کا فرض ہے کہ آپ وقتی طور پر اس حکومت کی خدمت ملازمین کی طرح کریں، سیاست دانوں کی طرح نہیں۔

پھر پشاور میں ۱۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو گزٹیڈ افسران کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

آپ کو کسی سیاسی جماعت یا کسی سیاست دان کے سیاسی دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔ اگر آپ پاکستان کے وقار اور عظمت کو بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی دباؤ کا شکار نہیں ہونا چاہیے، اپنا فرض منصبی عوام اور ملک کے خادم بن کر بے خوفی اور دیانت داری کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے۔

اور پھر ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں اسٹاف کالج میں فوجی قیادت کو واضح ہدایات دیں:

ایک بات اور ہے۔ مجھے یہ بات کہنے کی تحریک اس لیے ہوئی ہے کہ ایک دو نہایت اعلیٰ افسروں کے ساتھ گفتگو کے دوران مجھے یہ معلوم ہوا کہ افواج پاکستان نے جو حلف اٹھایا ہے انھیں اس کے مضمرات کا علم نہیں ہے۔ بلاشبہ حلف تو ایک ظاہری شکل وصورت کی بات ہوتی ہے۔ جو چیز زیادہ اہم ہوتی ہے، وہ ہے صحیح جذبہ اور اس کی روح۔ لیکن اس معاملے میں شکل وصورت بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں اس موقع پر آپ کے حافظے کو تازہ کرنے کے لیے مقررہ حلف کے الفاظ پڑھتا ہوں:

''میں خدا کو حاضر وناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور مملکت پاکستان کا وفادار رہوں گا۔ (آئین اور مملکت پاکستان کے الفاظ پر توجہ فرمایئے اور یہ) کہ میں مملکت پاکستان کی افواج میں دیانت داری اور وفاداری کے ساتھ خدمات سرانجام دینے کا پابند رہوں گا، اور اپنی بھرتی کی شرائط کے مطابق جہاں کہیں بھی ہوائی، بری اور بحری ذریعے سے جانے کا حکم ملے گا، جاؤں گا۔ اور میں ان تمام احکام کو بجالاؤں گا جو میرے اوپر تعینات شدہ افسر جاری کرے گا''۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے اصل بات تو جذبہ ہے۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں مملکت کے آئین کا وفادار رہوں گا تو آپ اس آئین کا مطالعہ کریں جو فی الوقت پاکستان میں نافذ العمل ہے

اور اس کے حقیقی اور قانونی مضمرات کو سمجھیں۔

قائد کے اس ارشاد کی روشنی میں سول اور فوجی ملازمین کی ذمہ داری ہے کہ دستور کا مطالعہ کریں اور اس حلف پر قائم ہو جائیں جو دستور میں مرقوم ہے۔ جو بھی اس عہد سے سرمو انحراف کرے اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہیے تاکہ آیندہ کسی کو اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو۔

ان حالات میں پوری قوم اور خود فوجی قیادت کے لیے اصلاح احوال کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اکتوبر کے انتخابات کی تیاری اور پوری دیانت کے ساتھ دستور کے مطابق منتخب قیادت کو زمام کار کی منتقلی۔ انتقام کی سیاست کی جگہ انصاف کی سیاست کا قیام وقت کی ضرورت ہے۔ جنرل پرویز مشرف کو بھی حالات کا دردمندی اور بصیرت سے جائزہ لینا چاہیے اور عوام کے فیصلے کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ کوئی شخص قانون سے بالا نہیں اور کوئی انسان ناگزیر نہیں۔ ملک کی ترقی اور استحکام، ملک کے نظریے سے وفاداری، قوم کی بیداری، اور اصلاح کے لیے قومی اتفاق رائے پیدا کرنے میں ہے۔

اگر ہماری قیادت ریفرنڈم کے تلخ پیغامات سے یہ سبق حاصل کرلے تو شر سے خیر پیدا ہوسکتا ہے اور ملک ترقی کی شاہراہ پر ایک بار پھر گامزن ہوسکتا ہے۔ خدا کرے کہ اس نازک لمحے میں یہ قوم اور اس کی قیادت صحیح فیصلہ کر سکے تاکہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور صبح امید، نئی روشنی لیے ہوئے نمودار ہو سکے۔

گھبرائیں نہ ظلمت سے گزرنے والے
آغوش میں ہر شب کے سحر ہوتی ہے

(ترجمان القرآن، جون ۲۰۰۲ء)